اسلامی تحریک

کے قائدین کی صفات

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی تحریک کے قائدین کی صفات

ہر تنظیم بنیادی طور پر دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ تنظیمی لحاظ سے دونوں کی حیثیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں، اور ان کی ذمے داریاں بھی جدا جدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو اس تنظیم میں 'اعضائے رئیسہ' کا سا مقام رکھتے ہیں، اور باقی تمام لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی حیثیت عام اجزائے جسم کی سی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی اجتماعی ادارہ نہ تو صرف اعضائے رئیسہ کی بہ دولت برقرار رہ سکتا ہے، نہ صرف عام اعضاء و جوارح کے بل پر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی زندگی، اس کی توانائی اور اس کی ترقی کے لیے چند چیزیں انتہائی حد تک ناگزیر ہوتی ہیں۔ جن میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنی اپنی ذمے داریوں کو ٹھیک طور سے ادا کرتے رہیں، انھیں اپنی اپنی حدود بھی معلوم ہوں اور اپنے فرائض کا بھی پورا پورا احساس ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اس علم اور اس احساس میں کوتاہ رہا تو یہ اجتماعی ادارہ ڈیڑھ پہیے کی گاڑی بن کر رہ جائے گا۔ اور اگر کوتاہی و خام کاری کے مرض میں دونوں ہی مبتلا رہے تو پھر گاڑی ٹوٹے ہوئے پہیوں پر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی بس جوں توں گھسٹتی رہے گی، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس کھڈ میں جا گرے گی۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو بالعموم ہر کام اجتماعی شکل میں، اور نظم کے ساتھ انجام دینے کی جو ہدایتیں دی ہیں، ان کا بیّن تقاضا ہے کہ اس دین کی حمایت اور نصرت واقامت کے لیے قائم کی جانے والی تحریکیں بھی ان کے تقاضوں کو اچھی طرح ملحوظ رکھیں، اور منظّم طور سے اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھائیں۔ اسلامی تحریکوں یا تنظیموں کے اعضائے رئیسہ 'جماعتی ذمہ دار' اور 'امراء' کہلاتے ہیں، اور عام اعضاء و جوارح ان کے ماتحت یا 'مامورین' ہوتے ہیں۔ خدا اور اس کے رسولؐ نے ان دونوں ہی قسم کے لوگوں کی ذمے داریوں کو بڑی وضاحت سے بیان فرما رکھا ہے، اور ان اخلاقیات پر بھی پوری طرح روشنی ڈال دی ہے، جن کی اس خصوص میں نمایاں اہمیت ہے۔

میں اس وقت موقعے اور ضرورت کی مناسبت سے، صرف انھی ذمے داریوں اور انھی اخلاقی صفات کی یاددہانی کرنا چاہتا ہوں، جو اسلامی تحریکوں کے اصحاب امر سے، خواہ وہ کسی درجے اور حیثیت کے ہوں، تعلق رکھتی ہیں۔

ایک جامع الفرائض دعا

قرآن کریم کی ایک دعائیہ آیت کا آخری ٹکڑا ہے:

...وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا O (الفرقان: ۷۴)

"...اور (اے پروردگار) ہمیں متقیوں کا سربراہ بنا۔"

اس دعا کا سادہ انداز میں مفہوم یہ ہے کہ خدایا! جو لوگ ہماری ماتحتی اور نگرانی میں ہیں انھیں تقویٰ کی راہ پر چلا۔

تین لفظوں کا یہ دعائیہ جملہ جوامع الکلم میں سے ہے، اور ایک فرض شناس مسلمان کی نگہِ جستجو کے لیے اس میں سب کچھ موجود ہے۔ کیوں کہ یہ اگرچہ بہ ظاہر صرف ایک دعا ہے، مگر اس دعا کے پس منظر میں ان سبھی واجبات اور صفات کے مطالبے موجود ہیں جن سے سچے اہل ایمان کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ جب ایک مردِ مومن اپنے رب سے یہ التجا کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اسے اہلِ تقویٰ کا سربراہ بنا دے، تو یہ التجا دعا ہونے کے ساتھ ساتھ لازماً اس عہد پر بھی مشتمل ہوتی ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک میں خود بھی اس مدعا و مطلوب کے حصول کے لیے کوشاں رہوں گا۔ کیوں کہ دعا صحیح معنوں میں دعا ہوتی ہی اس وقت ہے جب اس کا رشتہ دعا کرنے والے کی اپنی ممکنہ کوششوں سے جڑا ہوا ہو۔ آدمی اپنے مطلوب کے لیے خود تو کچھ نہ کرے، اور صرف یا ربِّ یا ربِّ پکارتا ہے تو یہ دعا نہیں، تمنی علی اللہ ہوگی، جو نہ عقلاً کوئی پسندیدہ چیز ہے نہ شرعاً۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اہلِ ایمان کو اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کی دعا کے ساتھ ساتھ کیا کوششیں انجام دینا اور دیتے رہنا چاہیے کہ ان کی یہ عظیم المقاصد دعا صحیح معنوں میں دعا بن جائے، تمنی علی اللہ بن کر نہ رہ جائے۔ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ دعا کرنے والا اپنے جن زیر اثر اور ماتحت لوگوں کو متقی دیکھنا چاہتا ہے، انھیں تقویٰ کی صفات سے آراستہ کر دینے یا آراستہ بنائے رکھنے کی جس طرح وہ خدا سے التجا کرے، اسی طرح اس مقصد کی خاطر خود بھی سعی و تدبیر کرتا رہے، اور اپنے ماتحتوں کو تقویٰ کے مقام تک پہنچا دینے میں اپنی سی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے۔ لیکن ذرا ٹھیریے، یہ جواب ابھی تشنہ

ہے، اور یہ مکمل اسی وقت ہوسکتا ہے جب معاملہ کا ایک اور اہم پہلو بھی سامنے آجائے، اور وہ یہ کہ اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کی دعا میں اگرچہ ذکر تو صرف ماتحتوں کے صاحبِ تقویٰ ہونے یا بنائے جانے کی التجا کا ہے، مگر لفظوں میں مذکور نہ ہونے کے باوجود اس التجا سے پہلے ایک اور اہم تر التجا بھی اس دعا میں موجود ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدایا! خود ہمیں بھی نہ صرف متقی بلکہ ان سب سے بڑھ کر متقی بنادے۔ کیوں کہ یہ بالکل بے معنی سی بات اور بڑی بے جا قسم کی جسارت ہوگی کہ آدمی خود تو تقویٰ کے معاملے میں کچھ یوں ہی سا ہو، مگر اللہ تعالیٰ سے عرض پر عرض کرتا رہے کہ وہ اسے متقیوں کا امام بنادے۔ ایسی عرض معروض تو اسی شخص کو زیب دے سکتی ہے، جو خود بھی صاحبِ تقویٰ ہو اور تقویٰ کی صفت سے اپنے کو بیش از بیش بہرہ ور کرتے رہنے کی بہ صدق دل اللہ سے التجا کرتا رہے، بلکہ اتقیٰ یعنی دوسروں سے بڑھ کر متقی ہو، یا اتقیٰ بن جانے کی فکر اور کوشش میں ہو۔ مذکورہ بالا سوال کا یہ مکمل جواب سامنے آجانے کے بعد واضح طور پر اہل ایمان کی ذمے داریاں دوگونہ قرار پاجاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ تقویٰ اور خدا پرستی کی راہ میں اپنے کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتے رہیں۔ دوسری یہ کہ اپنے ماتحت افراد کو بھی اس مدارِ دین ایمانی صفت سے بہرہ ور کرتے رہنے کے لیے برابر فکر مند اور کوشاں رہیں اور پھر دونوں ہی باتوں کے لیے خدا سے سچی دعائیں بھی کرتے رہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نظر میں رہنی چاہیے کہ تقویٰ کی صفت بہ جائے خود تو مطلوب دین ہے ہی، ساتھ ہی اس لیے بھی مطلوب اور ضروری ہے کہ جب تک پیروان اسلام کے اندر یہ ایمانی جوہر ایک معقول حد تک موجود نہ ہو، اس وقت تک اسلام اپنے پورے وجود کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ جو نظام رحمت لے کر آیا ہے وہ خدا کی زمین پر ہرگز قائم نہیں ہوسکتا اور اگر پہلے سے قائم ہو تو اپنی جگہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کوئی بھی اسلامی تحریک اپنے سفر کے اس اصل زادِ راہ سے تہی دامن رہ کر، یا اس کی محض معمولی سی مقدار کے بل پر کبھی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔

ان تمہیدی، مگر بنیادی نکتوں کے واضح ہوجانے کے بعد اب آیئے ان اہم صفات کو ذہن نشیں کرلیں، جو کسی اسلامی تحریک کے ذمے داروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ لازماً پائی جانی چاہییں، اور جن کی موجودگی پر ہی اس تحریک کی کام یاب پیش قدمی بہت بڑی حد تک موقوف رہتی ہے۔

۱۔ احتسابِ نفس

سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت تو احتسابِ نفس کی صفت ہے۔ جب تک اس احتساب پر بھرپور توجہ نہ رہے گی، اس وقت تک ذمے دارانِ تحریک ان صلاحیتوں اور صالحیتوں

کے مالک بن ہی نہیں سکتے، جو تحریک میں اقدام کی روح دوڑا سکتی اور اسے ترقی کی راہ پر رواں دواں رکھ سکتی ہیں۔ پس مبالغہ نہ ہوگا اگر احتساب نفس کو تحریک کی کام یابی کی شاہ کلید سمجھا جائے۔

یہ احتساب کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا نظری جواب اگرچہ ہم سب جانتے ہیں، مگر موضوعِ گفتگو کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس جانے ہوئے جواب کو پھر سے جان لیا جائے، تاکہ وہ ذہنوں میں تازہ ہو رہے۔ کیوں کہ یہ جواب جس قدر معلوم اور واضح ہے، اسی قدر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا دشوار، اور اس کا عملی نتیجہ کم یاب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نفس کی کیّادی بے مثال، اور اس کے حملوں کی شدت بے نظیر ہوتی ہے۔ یہ حملے اتنے شاطرانہ انداز کے، اور اس طرح چھپ کر ہوا کرتے ہیں کہ بس حضرات انبیاء ہی ان سے پوری طرح محفوظ رہ سکے ہیں۔ آدمی کو محسوس تک نہیں ہو پاتا اور وہ متاعِ دین و ایمان لوٹ لے جاتا ہے۔ یہ نفس جس شیطانِ اعظم کا ایجنٹ ہے وہ عین دربار خداوندی میں چیلنج دے آیا ہے کہ میں ابنِ آدم کو اپنی گرفت میں لے لینے کی کوئی تدبیر اور کوشش اٹھا نہ رکھوں گا، اور اس پر سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، غرض ہر جہت اور ہر رخ سے چھاپے ماروں گا۔ پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھانے میں کم از کم اسی نوے فی صد تو بہ ہر حال کام یاب رہا۔ کوئی چالاک دشمن جب بھی اپنے حریف پر دھاوا مارتا ہے تو اس کی طاقت کا اندازہ لگا کر مارتا ہے۔ شیطان اور اس کا ایجنٹ نفس امارہ اس اصول جنگ کا ماہر ہے۔ جو افرادِ انسانی جتنے ہی زیادہ قوی الایمان اور صاحب علم و عرفان ہوتے ہیں انھیں پھانس لینے کے لیے وہ اتنا ہی زیادہ مضبوط آہنی جال بچھاتا رہتا ہے۔ اور اگر وہ قوی الایمان اور صاحب علم و عرفان ہونے کے ساتھ ساتھ نصرت دین کے مرد میدان بھی ہوں تو وہ اپنے اس آہنی جال کی کڑیوں کو اور زیادہ کس دیتا ہے۔ صحیح معنوں کی اسلامی تحریکوں سے بڑھ کر اس موذی کا مبغوض اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بڑے سے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو تو شاید کچھ دیر کے لیے برداشت کر لے، مگر دین حق کا علم اٹھانے والوں کو ایک آن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس جنگی تدبیر سے بھی بہ خوبی آگاہ ہے کہ غنیم کے لشکر کو تہ و بالا کر کے رکھ دینے کی سب سے کارگر شکل یہ ہے کہ اس لشکر کے سالاروں اور کمانڈروں کا کام تمام کر دیا جائے پھر باقی فوج آپ سے آپ سفید جھنڈے لہرانے لگے گی۔ یہ خوف ناک حقیقت متنبہ کرتی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے عام ارکان بالعموم، اور ان کے ذمے دار بالخصوص، نفس اور شیطان کی طرف سے برابر چوکنے رہیں۔ ایک طرف تو انھیں ان کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے

رہنا چاہیے، دوسری طرف اپنے اندروں میں جھانک کر دیکھتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان نقب تو نہیں لگا رہا ہے۔ ان دو گونہ فکر مندیوں اور کوششوں کے بعد ہی اس توقع کا رکھنا حق بہ جانب ہوسکتا ہے کہ اس کے مذموم عزائم کام یاب نہ ہونے پائیں گے۔

۲- اخلاص نیت

احتساب نفس کے پہلو ایک دو نہیں، بہت سے ہیں۔ ان کی اہمیتوں کے درجات اور وقت کی گنجائش کو دیکھتے ہوئے میں یہاں صرف دو اہم ترین پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے پر اکتفا کروں گا۔

پہلی چیز جسے اس احتساب کے سلسلے میں خصوصیت سے ملحوظ رکھنا چاہیے، نیت کا اخلاص ہے۔ اہلِ ایمان کی نیتوں کا خلوص شیطان کے لیے حد درجہ سوہان روح ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شعلہ بار نگاہیں اسے برابر گھورتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے یہ لڑائی کا ایسا محاذ ہوتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اور اگر اسے توڑ دینے میں کام یاب ہوجاتا ہے تو دوسرے سارے مورچے آپ سے ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ گویا اکیلے اس محاذ کا ختم ہوجانا پوری لڑائی کے ہر جانے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد نہ نماز نماز رہ جاتی ہے نہ زکوٰۃ زکوٰۃ رہ جاتی ہے۔ دعوت الی اللہ، نصرتِ اسلام اور اقامتِ دین کے صرف دعوے اور الفاظ رہ جاتے ہیں، ان کے اندر سے معنویت اسی طرح غائب ہوجاتی ہے، جس طرح دل کی حرکت بند ہوجانے سے جسم سے زندگی ناپید ہو رہتی ہے۔ اس خوف ناک بلا کے خطروں سے مامون تو کوئی بھی نہیں ہوتا، مگر جو شخص جتنی ہی زیادہ نمایاں دینی پوزیشن رکھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ ان خطروں کی زد میں رہتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے ذمے دار اور اصحاب امر، خواہ وہ کسی درجے کے ہوں، اپنے اپنے دائروں میں بہ ہر حال ایک خاص پوزیشن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ پوزیشن بہ جائے خود بھی کم زور آدمی کے لیے فتنہ کا سامان بن جاسکتی ہے، نفس آسانی سے اسے یہ وہم دلاسکتا ہے کہ امارت کا یہ منصب اس کے لیے ایک اعزاز اور وجہ افتخار ہے، حالاں کہ فی الاصل وہ ایک بھاری ذمے داری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس منصب کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت نے اسے کسی مخصوص اور نمایاں قسم کی صلاحیت سے بھی نواز رکھا ہو ـــــ مثلاً تحریر و تصنیف کی صلاحیت، یا تقریر و خطابت کی صلاحیت، یا مؤثر افہام و تفہیم کی صلاحیت، یا حسن کارکردگی کی صلاحیت ـــــ تو پھر خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے اور غافل شخص بڑی آسانی سے تعلّی کا شکار اور شہرت کا حریص بن جاتا ہے۔ اپنی کسی

اچھی صلاحیت پر لوگوں کی تحسین سے خوشی محسوس کرنا تو کوئی معیوب بات نہیں، مگر جب یہ خوشی آگے بڑھ کر اپنی شخصیت کی بلند قامتی کے احساس فخر میں تبدیل ہوجائے تو پھر بڑی تباہ کن بیماری بن جاتی ہے۔ اس طرح کا احساس نہ صرف یہ کہ بہ جائے خود ایک انتہائی ناپسندیدہ چیز ہے، بلکہ وہ تحریر وتقریر کے مٹھ کو بھی مار دیتا ہے، اور بات کا اثر بس اپنی ایک لپک سی دکھا کر ختم ہو رہتا ہے۔ اور یہ اس تحریک کے حق میں ایک بڑی خیانت اور ایک بڑا ظلم ہے، جس نے اسے امارت کی کوئی چھوٹی یا بڑی ذمے داری سپرد کی ہوتی ہے۔

۳- شرائع کی پابندی میں عزیمت کا رویہ

احتساب نفس کے ضمن میں، تحریکی نقطۂ نظر سے، دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ذمے داران تحریک کو شرائع کی پابندی میں بالخصوص ان کی دونوں عملی بنیادوں ــــــ نماز اور زکوٰۃ ــــــ کے بارے میں نسبتاً زیادہ عزیمت کا رویّہ اختیار کیے رہنا چاہیے، اور معمولی معمولی عذرات کی آڑ ہرگز نہ لینی چاہیے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک بار ایک نابینا صحابیؓ نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ”میں ایک اندھا آدمی ہوں، اور مدینہ کی بستی میں سانپ، بچھو اور درندے کثرت سے نکلا کرتے ہیں، کوئی ایسا شخص بھی میسر نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا کرے، اس لیے حضور اجازت دے دیں کہ میں نماز گھر ہی میں پڑھ لیا کروں۔“ آپ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ اجازت حاصل کر کے جب وہ صاحب لوٹ کر جانے لگے تو انھیں واپس بلا کر آپ نے پوچھا: هَلْ تَسْمَعُ النِّداءَ بالصَّلوٰةِ (کیا تمھیں نماز کی اذان سنائی دیا کرتی ہے؟) انھوں نے جواب دیا کہ ”نَعَمْ“ (ہاں حضور سنائی تو دیتی ہے)۔ یہ سن کر آپ نے انھیں ہدایت فرمائی ”فَاَجِبْ“ (تو پھر اس کا جواب دیا کرو) یعنی پھر تو تمھیں مسجد آنا ہی چاہیے ــــــ اس حدیث سے اندازہ لگایے کہ عام اور معمولی عذرات کی بات اللہ و رسول کی نظر میں کتنی بے وزن ٹھہرا کرتی ہوگی۔

فقہی رخصتوں کا معاملہ بھی عذرات کے معاملے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اصحاب امر کو ان رخصتوں سے فائدہ اٹھانا بالکل زیب نہیں دیتا، الّا آں کہ خود شریعت ہی نے کسی رخصت پر عمل کرنے کو واجب یا مستحسن قرار دے رکھا ہو۔ رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کا مزاج دراصل دینی مزاج کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ دینی مزاج کی خامی ایک عام مسلمان اور ایک عام فرد تنظیم کے حق میں بھی کچھ کم افسوس ناک چیز نہیں، لیکن تحریک اسلامی کے اصحاب امر

کے حق میں تو اسے قابلِ ملامت ہی کہا جائے گا۔ کیوں کہ اس خامی کے اثرات صرف انھی کی ذات تک محدود نہ رہیں گے، بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ان کے مامورین پر بھی پڑ کر رہے گا اور یہ تحریک کا اتنا بڑا زیاں ہوگا جسے کوئی بھی حساس شخص انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

اصحاب امر کا مامورین کے ساتھ رویہ

یہ تو وہ خاص خاص اہم باتیں تھیں، جو اصحاب امر کے اپنے احتساب نفس اور اپنی اصلاحِ ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ان ذمے داریوں کی طرف آیئے جو ان پر ان کے مامورین کی نسبت سے عائد ہوتی ہیں۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصحاب امر کو اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے لیے کن صفات سے خاص طور پر متصف ہونا اور کن طور طریقوں پر کار بند رہنا ضروری ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اصحاب امر اور ان کے مامورین کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا واضح اصولی جواب رسول اکرم ﷺ کے اس مشہور ارشاد میں موجود ہے: **کُلّکُمْ راع و کلکم مسئول عن رعیته۔ الامام راع و مسئول عَنْ رعیته**...... الخ (بخاری) ''تم میں کا ہر شخص راعی اور نگراں ہے، اور تم سب کو اپنی اپنی رعیّتوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کا سربراہ ایک راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔'' یہ فرما کر آپؐ نے چند اور اقسام کے راعیوں اور ان کی رعیّتوں کی نام بہ نام مثالیں دے کر بات کو پوری طرح واضح کر دیا۔ اس ارشاد نبویؐ کے مطابق تحریکوں کے ذمے دار اور اصحاب امر بھی ایک خاص نوعیت کے راعی اور نگراں قرار پاتے ہیں، اور دنیا اور آخرت، دونوں ہی جگہ وہ اپنی اپنی 'رعیّتوں' کے، یعنی اپنے مامورین اور اپنے زیر نگرانی افراد تحریک کے بارے میں جواب دہ ٹھیرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اتنی بڑی ذمے داری ہے، جو راتوں کی نیند اڑا دے سکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی انجام دہی کا اجر بھی بہت بڑا ہے۔

یہاں اس بھاری ذمے داری کی نوعیت بھی سمجھ لینی چاہیے۔ یہ ایک واضح اصولی بات ہے کہ مختلف قسم کے راعیوں کی ذمے داریاں مختلف نوعیتوں کی ہوں گی، جن کا تعین ان راعیوں کی 'رعیّتوں' کے مفاد اور مصالح کی بنیاد ہی پر ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں تحریکی ذمے داریاں اور مسئولیتیں اپنے مامورین کے تئیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتیں کہ جس مقصد کی خاطر یہ لوگ ان کی رہ نمائی اور نگرانی میں دیے گئے ہیں، وہ انھیں اس مقصد کے کام کے آدمی بنائیں، ان کے اندر اپنے تحریکی نصب العین کے حق میں زیادہ سے زیادہ ذہنی یکسوئی پیدا کریں اور اس کی خاطر

جدو جہد کا حوصلہ پروان چڑھائیں، ان انفرادی اور اجتماعی اوصاف سے انھیں بیش از بیش آراستہ کرتے رہنے کی فکر اور کوشش کریں، جو تحریک کو مطلوب اور اللہ اور اس کے رسول کو محبوب ہیں۔

اصحاب امر اور مامورین کے درمیان تحریکی تعلق کی نوعیت اور اس کے تقاضے معلوم ہو جانے کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان صفات سے، جن کا حامل ہونا اور ان رویوں سے، جن کا اختیار کرنا اصحاب امر کے لیے ضروری ہے، واقفیت حاصل کر لی جائے۔

۱- نرم خوئی و نرم گیری

پہلی ضروری چیز نرمی اور لینت کی صفت ہے۔ اصحاب امر کو اپنے مامورین کے ساتھ ممکن حد تک نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے، اور اگر کبھی خود مفادِ تحریک کا تقاضا ہو کہ ان پر گرفت کی جائے تو اس گرفت میں بھی حتی الوسع سخت گیری سے بچنا چاہیے۔ پھر اتنی بات بھی کافی نہیں ہے کہ یہ نرم رویہ محض تدبیر اور پالیسی کے طور پر اپنا لیا گیا ہو، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ یہ تا حدِ امکان ان کا مزاج بن گیا ہو۔ یہ روش اور صفت سب سے زیادہ جس چیز کے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ تحریک کی ہیئت اجتماعیہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ہیئتِ اجتماعیہ اپنی صحت اور اپنے اندرونی استحکام کے لیے بڑی حد تک اصحاب امر کی اسی نرم روی پر انحصار کرتی ہے۔ جہاں کسی تحریک کا اجتماعی نظم اپنے اس سامان بقا سے محروم ہوا، اس کا نظامِ اعصاب اسی طرح ٹوٹ کر رہ جائے گا، جس طرح کسی زلزلے کے بعد پختہ عمارتیں بھی اندر سے چٹخ کر رہ جاتی ہیں۔ انسانی فطرت کے خالق نے کسی اور کو نہیں، خود اپنے پیغمبر اعظم ﷺ کو ایک بڑے اہم واقعہ کے بعد مخاطب کر کے فرمایا تھا:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ (آل عمران: ۱۵۹)

"سو یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ تم (اپنے) ان (ساتھی اہل ایمان) کے لیے نرم ہو۔ ورنہ اگر کہیں تند خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمھارے پاس سے چھٹ گئے ہوتے۔"

سوچیے اور بار بار سوچیے کہ جب تند خوئی اور سخت دلی کے ساتھ رسالت پناہؐ جیسی عظیم اور بے مثال شخصیت کے لیے بھی اپنے لوگوں کی جمعیت کو برقرار رکھ سکنا ممکن نہ ہوتا تو دوسرے کس شمار و قطار میں ہیں۔ معلوم ہوا کہ نرم مزاجی جہاں انسان کی سیرت کا ایک دل کش حسن ہے، وہاں اپنوں کو مضبوطی سے جوڑے رکھنے کا ایک ناگزیر ذریعہ بھی ہے۔ اس کے بغیر تحریک کا

اجتماعی نظم پائدار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نرم خوئی کس پائے کی ایمانی صفت ہے، اسے جاننے اور سمجھنے کے لیے قرآن کریم کا یہ بیان کافی ہے کہ حضور ﷺ کی نرم مزاجی فی الواقع اللہ تعالیٰ کی رحمت خاص کا عطیہ تھی۔ آں حضرتؐ نے بھی اس وصف کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

من یُحرَمِ الرفقَ یُحرَمِ الخیرَ کلَّهٗ۔ (بخاری)

''جو شخص نرم مزاجی سے محروم ہو، وہ (گویا) ساری بھلائیوں سے محروم ہے۔''

غور کیجیے کہ جب نرم مزاجی سے محرومی آدمی کو اپنی شخصی زندگی میں ساری بھلائیوں سے محرومی کا باعث بن جاتی ہے تو یہ جماعتی زندگی کے لیے کیا کچھ مصیبتیں نہ پیدا کر دے گی، اگر خدانخواستہ اس کے اصحاب امر اس محرومی کا شکار ہوں؟

نرم خوئی، رفق اور لینت سے محرومی کے معنی تند خوئی اور سخت گیری کے ہیں۔ سخت مزاج امراء و حکام نبی اکرم ﷺ کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم ہیں کہ رحمۃ للعالمین اور رؤف و رحیم ہونے کے باوجود آپؐ ان کے حق میں دلوں کو ہلا دینے والی یہ بددعا کرنے پر مجبور ہو گئے:

اللّٰھمَّ من ولِیَ مِنْ اَمْرِ امّتی شیئا فشق علیھم فاشقُق علیه۔ (مسلم)

''اے اللہ! جو کوئی میری امت کے کسی معاملے کا ذمے دار ہو اور وہ لوگوں پر سختی کرے، تو اس پر تو سختی کر۔''

سختی اور سخت گیری کا یہ ہول ناک انجام سامنے رکھیے۔ نرمی اور نرم خوئی کی قدر و قیمت آپ سے آپ معلوم ہو جائے گی۔

۲- عفو و درگزر

نرم خوئی اور لینت سے نہایت قریبی تعلق رکھنے والی ایک خاص صفت جماعتی معاملات میں عفو و درگزر سے کام لینے کی صفت ہے، جس سے اصحاب امر کا متصف رہنا خصوصیت سے انتہائی ضروری ہے۔ عفو و درگزر کی مدح و منقبت سے، اور اس کی ترغیب و تاکید سے کتاب الٰہی بھری پڑی ہے اور رسول خدا ﷺ کی حیات مبارکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ غزوۂ احد کے موقعے پر مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی سے لڑائی کا پانسہ یکایک مشرکوں کے حق میں پلٹ گیا تھا اور اس کے نتیجے میں بہت سے صحابہؓ کی شہادت کا، اور خود نبی اکرم ﷺ کے زخمی ہو جانے کا الم ناک سانحہ پیش آ گیا تھا۔ مسلمانوں کی یہ غلطی کوئی معمولی غلطی نہ تھی۔ دنیا کا کوئی اور سپہ سالار ہوتا تو

ایسے لوگوں کا کورٹ مارشل کر کے انھیں بدترین سزائیں دیے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا۔ لیکن حضور ﷺ نے اپنے ان خطا کار لشکریوں کے حق میں کسی اقدام کی بات سوچی تک نہیں اور عفو عام سے کام لیا، جس کی اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تصویب فرمائی، بلکہ تحسین بھی کی، اور اسے اپنی رحمت کا ثمرہ قرار دیا، جیسا کہ آپ ابھی فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ کے الفاظ الٰہی میں سن چکے ہیں۔ اور پھر اس تحسین ہی پر اکتفا نہیں کر لیا بلکہ ساتھ ہی آپ کو اس بات کی ہدایت بھی کی کہ:

فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ ۚ

(آل عمران:۱۵۹)

''انھیں معاف کر دو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو، اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔''

مقصود اس ہدایت کا یہ تھا کہ انھیں معاف کرنے ہی تک اپنی روش کو محدود نہ رکھو، بلکہ آگے بھی ایسا رویہ اختیار کرو، جس سے انھیں اطمینان ہو جائے کہ یہ معافی کوئی رسمی اور قانونی معافی نہیں ہے بلکہ حقیقی معافی ہے۔ زبان مبارک ہی نے نہیں، قلب اطہر نے بھی انھیں معاف کر دیا ہے اور اب ان سے سرزد ہو جانے والی غلطی کا کوئی انقباضی اثر آپ پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ مقتدائے عالم ﷺ کو دی جانے والی اس ہدایت میں عام افراد امت کے لیے بالعموم اور کسی طرح کی جماعتی ذمے داریاں رکھنے والوں کے لیے بالخصوص، رہ نمائی کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ اس امر کی کھلی ہوئی تلقین ہے کہ جماعتی معاملات میں اگر عام افراد سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اصحاب امر کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے، اور یہ کہ یہ عفو و درگزر صدق دل سے ہو، محض قانونی انداز کا نہ ہو۔ بلاشبہہ یہ کوئی لازمی کلیہ نہیں ہے، اور بعض اوقات خود تحریک ہی کا مفاد تقاضا کرتا ہے کہ اس موقعے پر سرزنش سے کام لیا جائے۔ لیکن یہ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں۔ عام روش عفو و درگزر ہی کی رہنی چاہیے۔ اس کے بغیر جماعتی نظم میں باہمی حسنِ تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔

۳۔ صبر و تحمل

نرم خوئی سے ایسا ہی قریبی تعلق رکھنے والی ایک اور بھی ضروری صفت صبر و تحمل کی صفت ہے۔ یہاں صبر و تحمل سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر ناروا حملوں کے موقعے پر اپنا غصہ پی جائے۔ اشتعال انگیز حالات میں برداشت سے کام لینا عام طور سے بہت مشکل ہوتا ہے، مگر جس قدر یہ چیز کڑوی ہوتی ہے اسی قدر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے، اور تحریکی زندگی کے لیے تو یہ

پھل مقوی غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی اسلامی تحریک کے سربراہ اگر خدانخواستہ اپنے اندر صبر و تحمل کا مادہ نہ رکھتے ہوں تو صرف ان کی اپنی ذات ہی نہیں، تحریک بھی اس کا خمیازہ بھگتنے سے نہیں بچ سکتی۔ اصحاب امر کو اپنی ذات پر ہونے والی ناروا تنقیدوں سے سابقہ پیش آنا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ ہر تنظیم میں ایسے خام کار لوگ موجود ہوا ہی کرتے ہیں، جو حدود کا لحاظ نہیں رکھ پاتے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے اگر اشتعال انگیز حرکتیں ہو جائیں تو ان پر غصہ کا آنا فطری ہے اور یہ شرعاً بھی کوئی مذموم چیز نہیں ہے۔ مذموم بات صرف یہ ہے کہ غصہ کے عالم میں صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا جائے۔ زندگی کے ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی حضور اکرم ﷺ کا اسوہ ہی ایک مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہے۔ آپ کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ آپؐ نے اپنی ذات کے خلاف ہونے والی کسی زیادتی کا کبھی انتقام نہیں لیا، بلکہ ہر بات پر صبر کیا۔ مثال کے طور پر دو واقعات کا سن لینا کافی ہوگا: پہلا واقعہ غزوۂ حنین کے موقعے کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ ”جنگ حنین میں حاصل ہونے والے اموال غنیمت کو حضورؐ نے جب لوگوں میں تقسیم کیا تو (دعوت اسلامی کے پیش نظر) کچھ اشرافِ عرب کو باقی لوگوں پر اس معاملے میں ترجیح دی اور انھیں نسبتۂ زیادہ دیا۔ ایک ان گھڑ شخص نے یہ دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ واللّٰہ ھذہٖ قسمۃ ما عدل فیھا وما اُرید فیھا وجہ اللّٰہِ (بہ خدا یہ ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے اور اس میں اللہ کی رضا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے)۔ جب آپ تک یہ بات پہنچی تو چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ سرخ رنگ کی طرح لال ہو گیا۔ مگر صرف اتنا فرما کر آپؐ خاموش ہو رہے کہ:

فمن یعدلُ اِذا لم یعدل اللّٰہ و رسولہٗ ثم قال یرحم اللّٰہ موسٰی قد اوذی باکثرَ مِنْ ھٰذا فصَبَر۔ (بخاری)

”اگر اللہ اور اس کا رسول ہی عدل نہ کرے گا تو پھر اور کون کر سکتا ہے؟ پھر فرمایا: اللہ موسیٰ کو اپنی رحمت سے نوازے، ان کی اس سے بھی بڑھ کر دل آزاری کی گئی تھی، مگر انھوں نے ہر بات پر صبر کیا۔“

دوسرا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائے جانے والے بہتانِ عظیم کا ہے۔ اس واقعے کے نتیجے میں مسلسل ایک ماہ تک آپ نے جس قلبی اذیت کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اتنا کچھ ہو جانے پر بھی صبر و تحمل کے اس پیکر مقدس نے ایسی عالی ظرفی سے کام لیا، جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ دونوں واقعات ایسا آئینہ ہیں، جس

میں حضور اکرم ﷺ کی شانِ صبر و تحمل کی پوری کیفیت دیکھ لی جاسکتی ہے۔ آپؐ کے اس اسوے میں افراد ہی کی ایمانی زندگی کا نہیں، جماعت کی بھی اندرونی صحت و توانائی کا راز چھپا ہوا ہے۔

۴۔ فروتنی

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو ان کے اہل ایمان اصحابؓ کے سلسلے میں جو مختلف ہدایتیں دی تھیں، ان میں سے ایک اہم ہدایت یہ بھی تھی:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ (الشعراء:۲۱۵)

''اپنے اہل ایمان پیرووں کے لیے اپنے بازووں کو جھکائے رکھو۔''

بازووں کو جھکائے رکھو، یعنی فروتنی اور تواضع کا رویّہ اپنائے رکھو۔ تواضع اگرچہ بہ جائے خود ایک اعلیٰ انسانی جوہر اور ایمانی صفت ہے۔ لیکن آیت کا موقع کلام اور اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں آپؐ کو اس کی تلقین، دعوت اسلامی کے مفاد کے خصوص میں کی گئی ہے۔ اور یہ مفاد دعوت یہ تھا کہ آپ کا یہ متواضعانہ رویہ پیروان اسلام کے اندر آپ کی ذات اور دعوت، دونوں سے گرویدگی پیدا کرے گا۔ جب حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے داعی حق اور سربراہ کو بھی اپنے نصب العین کی خاطر کام یاب جدوجہد کرنے کے لیے اپنے پیرووں کے ساتھ فروتنی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی تو دوسروں کو یقینی طور پر بہ درجہ اولیٰ ہوگی، اور اس سے صرف نظر کر کے کوئی سربراہ بھی اپنے تحریکی منصب کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

لیکن فروتنی و خودشکنی کی روش، اختیار کیے رہنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے اور عام لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے، جو کوئی نمایاں پوزیشن رکھتے ہوں۔ کیوں کہ یہ پوزیشن ان کے لیے ایک فتنہ بن جانے کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے تحریکی سربراہوں کے لیے اس خلق کریم سے بہرہ ور ہونا بڑا ذہنی ریاض چاہتا ہے۔ اس ذہنی ریاض کی پہلی ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی ذمے دارانہ حیثیت کی صحیح نوعیت کا گہرا شعور حاصل ہو۔ پھر یاد کر لیجیے کہ کسی اسلامی تحریک میں مناصب کی حیثیت اصلاً نہ تو کسی استحقاق کی ہوتی ہے نہ کسی اعزاز کی ہوتی ہے، بلکہ ایک ہمت آزما بھاری ذمے داری کی ہوتی ہے۔ اصحاب امر کی فروتنی، اگر وہ فی الواقع فروتنی ہو، وہ کیمیا ہے جو انھیں زر خالص بنا دینے میں بڑا اہم رول انجام دیتی ہے۔ یہ بہ ظاہر ایک پستی ہوتی ہے، مگر فی الواقع عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے بشارت دی ہے:

مَا تواضعَ احدٌ لِلّٰہِ اِلّاَ رَفعَہُ اللّٰہُ عزَّوجلَّ۔ (مسلم)

''جو شخص اللہ کے لیے متواضعانہ روش اختیار کرتا ہے۔ اللہ بزرگ و برتر اسے بلند کر کے رہتا ہے۔''

فروتنی اور تواضع کا یہ ثمرہ تو آدمی کی اپنی ذات کو ملتا ہے۔ تحریک کو اس کا فائدہ اس سے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ ایسے اصحاب امر اپنے مامورین کی نگاہوں کا تارا بن جاتے ہیں۔ اور ان کی امارت ان لوگوں کے ظاہر ہی کی طرح ان کے دلوں اور دماغوں پر بھی قائم ہو جاتی ہے۔ اور فی الواقع ایسے ہی اصحاب امر وہ اصحاب امر ہوتے ہیں جو اپنے مامورین کے اندر طاعت امر کا، اور دعوتی جدوجہد کا ولولہ پیدا کر سکتے اور اسے بیدار رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول خدا ﷺ نے مسلمانوں کے اچھے امراء اور حکام انھیں قرار دیا ہے، جن سے ان کو دلی محبت ہو:

خیار اِئمتکُم الذین تحبُّونَھُم و یحبونکم و تصلونَ علیھم و یصلون علیکُم۔ (مسلم)

''تمھارے اچھے امام و پیشوا وہ ہیں جن کو تم محبوب رکھو اور جو تم سے محبت رکھیں، جن کے لیے تم دعائے رحمت کیا کرو اور جو تمھارے لیے دعائے رحمت کریں۔''

جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا، امراء و ذمے داران تحریک کے لیے محبوبیت کے اس مقام کا حاصل ہونا بہت کچھ ان کے متواضعانہ رویے پر موقوف ہے۔

۵- مامورین کی خیر خواہی

اپنے زیر امارت افراد کی دلی خیر خواہی بھی ان خاص اور اہم صفات میں سے ایک ہے جن سے ذمے دارانِ تحریک کا متصف رہنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ کبھی کام یاب صاحب امر نہیں بن سکتے۔ یہ ان کے عین منصب کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مامورین کی بہی خواہی کو اپنے فکر و عمل کا جزو بنائے رکھیں، جہاں تک ممکن ہو، ان کے نجی حالات سے بھی بے خبر نہ رہیں اور اگر وہ کسی مشکل سے دوچار ہوں تو اس کے حل میں ان کی لازماً معاونت کریں۔ یہ ان کی شرعی ذمے داری ہے۔ نبی ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے:

ما مِنْ اَمیر یلی امور المسلمین ثم لاَ یجھَد لھم و لاَ ینصَحُ لھم الاّ لَمْ یدخل معھم الجنۃَ۔ (مسلم)

''ہر وہ امیر، جو مسلمانوں کے معاملات کا نگراں وذمے دار ہو، مگر وہ ان کے (بھلے کے) لیے جدو جہد نہ کرے نہ ان کی خیر خواہی کرے، وہ ان کے ساتھ جنت میں نہ داخل ہو سکے گا۔''

من ولّاہ اللّٰہ شیئا مِن امور المومنین فاحتجب دون حاجتھم و خلتھم و فقرھم احتجب اللّٰہُ دون حاجتہ و خلتہ و فقرہٖ یومَ القیامۃ۔ (ترمذی)

''جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی معاملے کا بھی والی وانتظام کار بنایا ہو وہ اگر ان کی ضرورتوں، حاجت مندیوں اور ناداریوں کے مسائل اپنے تک نہ پہنچنے دے، تو قیامت کے دن اللہ اس کی ضرورتوں، حاجت مندیوں اور ناداریوں کی طرف سے پردہ کر لے گا۔''

اپنے مامورین کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے کی یہ اہمیت تو اخروی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ تحریکی اور تنظیمی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ مامورین کی نفسیات پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اپنے ذمے داروں کے ساتھ ان کی محبت اور الفت میں اضافہ ہوتا ہے، دوسری طرف تحریک کے فروغ کے لیے ان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ متحرک سے متحرک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں نتائج الٹے نکلتے ہیں۔ ذمے داروں اور مامورین کے درمیان وہ قربت باقی نہیں رہتی، جو رہنی چاہیے اور پھر تحریک کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کے طرز عمل کو یاد کیجیے۔ آپ عامۃ المسلمین کے ساتھ جس محبت، شفقت اور بہی خواہی کا برتاؤ کرتے اور ان کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا جتنا خیال رکھتے تھے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ایک صحابیؓ کا یہ بیان مذکور ہے کہ ''ہم کچھ نوجوان، جو سب کے سب تقریباً یکساں عمر کے تھے، خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ کے پاس بیس روز تک ٹھہرے رہے۔ رسول اللہ ﷺ بڑے رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ آپ نے از خود محسوس کر لیا کہ ہمیں اپنے اہل وعیال کی یاد آ رہی ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی آپؐ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تم لوگ اپنے گھروں پر کن کن کو چھوڑ کر آئے ہو۔ ہم نے جو بات تھی بتادی۔ صورت حال معلوم کر کے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ارجعوا الٰی اَھلیکُم فاقیموا فیھم وَ عَلِّمُوھُم وَ مروھُم۔

''اپنے اہل و عیال کے پاس واپس جاؤ، ان کے درمیان مقیم رہو، اور انھیں دین سکھاتے اور اچھے کاموں کی تلقین کرتے رہو۔''

۶- اصلاح و تربیت کا حکیمانہ انداز

قرآن کریم نے دعوت الی اللہ کے جو اصولی طریقے تلقین فرمائے ہیں، ان میں سے ایک ''موعظۂ حسنہ'' کا اصول بھی ہے۔ اس ''موعظتِ حسنہ'' کے اصول کو اسلامی تحریکوں کے نظام تربیت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھنا چاہیے۔ پند و نصیحت اگر مخلصانہ اور دردمندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کا انداز بھی لیے ہوئے ہو تو اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے، اور اصلاح و تربیت کے سو پروگراموں اور رسمی تدبیروں پر بھاری ثابت ہوتی ہے۔ مربی اعظم ﷺ اصلاح و تربیت کا عام طور سے جو طریقہ اپنایا کرتے تھے اور اس کے جو نتائج نکلتے تھے، اس کی صرف دو مثالیں سن لیجیے۔

سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ ایک بار آپؐ نے حضرت خزیم الاسدیؓ کے بارے میں فرمایا:

نعمَ الرجل خزیم الاسدی لولاَ طول جمته و اسبال ازارہٖ۔

''خزیم بڑے اچھے آدمی ہیں، کاش ان کے بالوں کی لٹ اتنی لمبی، اور ان کی تہ بند نیچے تک لٹکتی نہ ہوتی۔''

نتیجہ اس طرز تربیت کا حسب توقع یہ نکلا کہ حضورؐ کے یہ الفاظ حضرت خزیمؓ تک پہنچے تو دل میں تیر بن کر اتر گئے، انھوں نے ایک چھری اٹھائی اور اپنی لٹوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی طرح روایت ہے کہ آپؐ نے اپنے ایک صحابی، حضرت عبداللہؓ کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا:

نعمَ الرجل عبد اللّٰہ لَوْ کان یصلی باللیلِ۔ (بخاری)

''عبداللہ خوب آدمی ہیں، کیا اچھا ہوتا کہ وہ رات میں نماز بھی پڑھا کرتے۔''

حضرت عبداللہؓ کو جب حضورؐ کا یہ ارشاد معلوم ہوا تو ذہن نے معاً فیصلہ کرلیا اور پھر وہ راتوں میں بہت کم سونے لگے۔

آدمی جن خامیوں کا شکار ہوتا ہے اور جن کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں: ایک تو کردار کی خامی، دوسرے انداز فکر کی خامی۔ کردار کی خامی کی اصلاح کے سلسلے میں حضورؐ کا انداز بالعموم ایسا ہی حکیمانہ اور مشفقانہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ انداز فکر کی خامی

آپ کی نگاہ میں زیادہ قابل توجہ اور قابل گرفت قرار پاتی تھی۔ اس لیے اس کی اصلاح کے اندر حکمت کے ساتھ تنبیہ اور قدرے زجر وتوبیخ کا عنصر بھی شامل ہوا کرتا تھا، اور وہ بالعموم ''ما بال اقوامٍ'' کے لفظوں سے شروع ہوتا تھا۔ یعنی آپؐ ایسے مواقع پر یوں فرمایا کرتے کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے یا ایسا ایسا کہتے ہیں۔ گویا ایسے مواقع پر بھی آپ فکری خامی کا مظاہرہ کرنے والوں کے نام لیے بغیر نصیحت اور تنبیہ بالکل عمومی انداز میں فرمایا کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز کلام آپؐ اس مصلحت کی خاطر اختیار فرماتے کہ لوگوں میں کہیں ناگواری کا جذبہ نہ ابھر آئے اور اس طرح نصیحت و تنبیہ کا مقصد ہی فوت ہوکر نہ رہ جائے۔ اصلاح وتربیت کے بارے میں ہمیں بھی اسی اسوے کی پیروی کرنی چاہیے۔ کیوں کہ اس اندازِ تربیت سے بہتر انداز دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

یہ تھیں وہ چند ضروری یاددہانیاں جو اس موقعے پر آپ حضرات کو کرا دینی مناسب معلوم ہوئیں۔ خدا کرے کہ انھیں دل کے کانوں سے سنا گیا ہو، اور یہ اپنے مدعا کو، کسی نہ کسی حد تک، حاصل کرلینے میں کام یاب ہو جائیں۔

گفتگو ختم کرنے سے پہلے ایک کھٹک کا دور کر دینا ضروری ہے، جو ان معروضات کے سننے سے بعض ذہنوں میں پیدا ہوسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ بحث میں جن آیتوں اور حدیثوں کے حوالے دیے گئے ہیں، ان میں سے بیشتر کا راست تعلق اصطلاحی اور حکومتی امراء وحکام سے ہے، تحریکی اصحاب امر سے نہیں۔ بلاشبہہ حقیقت واقعی یہی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس سے کوئی بڑا اور بنیادی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ ان آیتوں اور حدیثوں میں جو اصل روح کارفرما ہے وہ تحریکی ذمے داروں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری اور واجب الاعتناء ہے جتنی اصطلاحی امراء وحکام کے لیے ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ آیات واحادیث سربراہان تحریک کے لیے اور زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اصطلاحی امراء و حکام کو بنا بنایا اسلامی معاشرہ ملا ہوتا ہے، جب کہ تحریکوں کے سربراہوں کو اسلامی معاشرہ بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا کام ان کے مقابلے میں دوگنا بھاری ہوتا ہے۔ پھر اصطلاحی امراء وحکام کے پاس اقتدار کی طاقت ہوتی ہے، اس لیے اگر وہ اخلاقی حیثیت سے کچھ خام ہوں، تب بھی اپنا فرض منصبی کسی نہ کسی حد تک انجام دے ہی سکتے ہیں۔ لیکن تحریکوں کے اصحاب امر کی کل طاقت ان کی یہی اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔ اس لیے اگر خدانخواستہ وہ اس سے تہی دامن رہ گئے تو اپنے فرض کی ادائی میں ناکام ہوجانے سے نہ بچ سکیں گے۔